© rasailojaraid.com

''اسلام کی اندرونی صدائیں''
تحمل اور تنوع پر چار تناظر

باہمان بختیاری اور آگسٹس رچرڈ نارٹن*

ترجمہ: سید محمد علی بن عزیز

مسلمان دانشوروں اور غیر مسلموں کے درمیان عموماً اسلام کی جمہوریت کے ساتھ مطابقت کے موضوع پر بحث ہوتی ہے، یا اس بات پر کہ کن عوامل کے تحت اسلام سیاسی تشدد کی حمایت کرتا ہے۔ اسلام میں احیاء، تحمل اور اختلاف رائے کے مباحث ذہن میں رکھتے ہوئے ہم نے مشہور مسلمان مفکرین کے ساتھ ملاقاتوں کا ایک سلسلہ شروع کیا۔ اس مضمون میں ہم ان دانشوروں اور مذہبی شخصیات کے خیالات سے انتخاب پیش کر رہے ہیں۔

جمال البناء کے افکار سے جو اقتباس یہاں پیش کیے جا رہے ہیں ان سے ان کی غیر معمولی تحریروں کی وسعت کا اندازہ ہوتا ہے جو انہوں نے ساٹھ سال کے عرصے میں لکھیں اور صرف عربی زبان میں دستیاب ہیں۔ جمال البناء، اخوان المسلمین کے بانی حسن البناء کے بھائی ہیں۔ البتہ جمال البناء کو اکثر الاخوان کی اسلام کے بارے میں قدامت پرست سوچ کا نقاد سمجھا جاتا ہے۔ ۱۹۴۶ء میں اپنی کتاب ''نئی جمہوریت'' میں انہوں نے اخوان المسلون کو ہدایت کی تھی کہ وہ ''عقیدے کے بجائے انسانوں پر یقین رکھیں''۔ ان کے خیالات کی سب سے بہتر عکاسی غالباً ان کی کتاب ''اسلام مذہب اور ریاست نہیں بلکہ مذہب اور معاشرہ ہے'' (۲۰۰۳ء) سے ہوتی ہے۔

اس کتاب میں وہ یہ نکتہ اٹھاتے ہیں کہ اسلام موجودہ نظام ہائے سیاست کے لیے کوئی مخصوص ماڈل پیش نہیں کرتا اور یہ کہ تمام سرگرمیوں کا اصل مرکز سیاست کے بجائے معاشرے کو بنایا جانا چاہیے۔ ان کی

*Bahman Baktiari and Agustus Richard Norton, "Voices whithin Islam: Four Perspectives on Tolerance and Diversity", *Current History*, January 2005, Pages: 37-45

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

تحریریں مباحث کو آگے بڑھاتی ہیں بالخصوص ان کی حالیہ کتاب (پردہ/نقاب) میں ان اسلامی کارکنوں پر تنقید کی گئی ہے جو اپنے ایمان کے اظہار کی علامت کے طور پر خواتین پر جبر کرتے ہیں۔

جمال البناء نے اپنے وطن مصر میں اپنی زوردار آواز آزاد خیال اور اسلامی پس منظر رکھنے والے مصری کارکنوں دونوں کی حمایت میں اٹھائی ہے جہاں اپنی دلیر آواز اور روشن خیالی کی بنا پر ان کی بہت عزت کی جاتی ہے۔ اگر ان کے کام کی تلخیص کی جائے تو یہ ایک جملہ کافی ہوگا کہ ''اسلام میں تدبر ضروری ہے''۔ وہ اس پر بار بار زور دیتے ہیں کہ قرآن اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مکمل طور پر فکری آزادی کے تصور کو تسلیم اور رائے کے اختلاف کو پسند اور دوسروں کے نظریات کا احترام کرتے ہوئے فیصلہ قیامت کے دن اللہ کی ذات پر چھوڑ دیتے ہیں۔

جہاں اسلامی دانشوروں میں جمہوریت کے بارے میں ہونے والے مذاکرات اہم ہیں وہیں مسلمان مفکرین میں ہونے والے کئی مباحث اس فکر میں ہیں کہ مسلمانوں کو اپنا مذہب کیسے سمجھنا اور اس کا استحضار کس طرح کرنا چاہیے۔ یہ چیز شام کے ایک انجینئر محمد شہرور کے ایک طویل مضمون میں دیکھی جا سکتی ہے۔

شہرور اپنی بہترین فروخت ہونے والی پہلی کتاب ''کتاب اور قرآن: ایک معاصر مطالعہ'' کی وجہ سے مشہور ہیں جو بالخصوص عرب دنیا کے درمیانے طبقے کے تعلیم یافتہ عوام میں بے حد مقبول ہے۔ ۱۹۹۰ء میں شائع ہونے والی یہ ایک نسبتاً ضخیم اور دقیق کتاب ہے۔ لیکن اس کے دلائل کا ماخذ شہرور کا یہ پختہ خیال ہے کہ قرآن کو ایک فکر کے طور پر پڑھا جانا چاہیے جیسے وہ پیغمبر محمد [صلی اللہ علیہ وسلم] پر ابھی ابھی نازل ہوئی ہو۔ نہ کہ صدیوں کی چھنی ہوئی تشریحات کے ذریعے عہد حاضر کے کئی مسلمانوں کی طرح جو سنجیدگی سے اپنے مذہب کے بارے میں سوچتے ہیں، شہرور کی بھی ایک مذہبی دانشور کی حیثیت سے تربیت نہیں کی گئی تھی۔ انہوں نے زرعی انجینئرنگ (Soil Enginering) میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری یونیورسٹی کالج ڈبلن سے حاصل کی ہے۔ وہ دمشق میں لکھنے اور کام کرنے کا سلسلہ جاری رکھے ہوئے ہے اور اکثر عرب دنیا میں سیٹلائٹ ٹیلی وژن پر اظہار خیال بھی کرتے ہیں۔

ایک اور اصلاح پسند مفکر اور توانا آواز محسن کادیور ہیں۔ محسن کادیور کا تعلق ایران سے ہے۔ اس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ملک میں ایک طرف اصلاح پسند ہیں جو عوامی جواب دہی کی بنیاد پر ایک نظام تشکیل دینا چاہتے ہیں اور دوسری طرف وہ قدامت پرست ہیں جو اسلام کی سخت تشریح کے ذریعے اقتدار کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتے ہیں۔ایران میں ان دونوں گروہوں کے درمیان ایک شدید کشمکش موجود ہے۔

کادیور جو کہ ایک مجتہد ہیں، اسلامی جمہوریہ کے اس نظریاتی میدان جنگ میں مذہب کی زبان جیسے اہم ہتھیار سے لیس ہو کر آتے ہیں، وہ جمہوریت کے بارے میں لکھتے ہیں۔لیکن اسلامی ریاست کے خاتمے اور اسلامی نظام حکومت کو ایک لادینی نظام حکومت سے بدلنے کے خواہاں نہیں ہیں۔البتہ ۱۹۹۹ء میں انہیں جھوٹے حقائق بیان کرنے، اسلام کو بدنام کرنے اور رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے الزامات لگا کر جیل میں ڈالا گیا تھا۔اٹھارہ ماہ بعد رہائی پانے کے بعد کادیور اپنے خیالات کے پرچار میں مزید پرعزم ہیں اور قید و بند نے ان کی شہرت میں مزید اضافہ کیا ہے۔

کادیور کا تقابل بعض دفعہ مارٹن لوتھر یا جون کالون جیسے ان مذہبی راہنماؤں سے کیا جاتا ہے جنہوں نے رومن کلیسائی اصولوں میں ترامیم کی تھیں۔ان کے افکار اور تحریریں نہ صرف مفکرین کی بلکہ تحقیقاتی کاموں سے منسلک نوجوان مذہبی راہنماؤں کی بھی بھرپور توجہ اپنی جانب مبذول کرالیتی ہیں۔وہ اسلامی فلسفے اور الٰہیات میں ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے حامل ہیں اور ۱۹۹۷ء میں اجتہاد کی باقاعدہ سند بھی حاصل کر چکے ہیں۔کادیور انسانی حقوق، تحمل، جمہوری طرز حکومت اور غیر مسلموں کے ساتھ تعلقات جیسے اہم معاملات میں مسلمانوں کے مستقبل کے طرز فکر کو متاثر کر دینے کی قابلیت رکھنے والے وقت کے ایک منفرد دانشور ہیں۔

کادیور کے برعکس، آیت اللہ محمد بوجنوردی ایران کے مذہبی راہنماؤں کے موجودہ قدامت پرست نظام کے صف اوّل کے راہنما ہیں۔وہ ۱۹۷۹ء کے انقلاب ایران سے پہلے عراق میں نجف کے مقام پر رہ چکے ہیں اور آیت اللہ روح اللہ خمینی کے ان قریبی معتمدین میں سے ہیں۔۱۹۸۴ء میں آیت اللہ خمینی نے بوجنوردی کو مجلس عدالت عالیہ (Supreme Judicual Coancil) کا امیر بنا دیا جو کہ قانون سازی کا ادارہ ہے۔

بوجنوردی خود کو ایک عملی انسان کی حیثیت سے متعارف کراتے ہیں اور انہوں نے ایرانی بنیاد

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

پرستوں کے انتہا پسند رویوں پر تنقید کی ہے۔ وہ ایرانی سیاسی مصلحین میں ایک روشن خیال قدامت پرست کی حیثیت سے جانے جاتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ اصلاح پسندوں کی اس بات سے متفق ہیں کہ اسلامی جمہوریہ نے بعض دفعہ غیر ضروری طاقت استعمال کر کے عوام کو تنہا کیا ہے۔ چنانچہ دیگر قدامت پرست شخصیات کے برعکس بوجنوردی ایرانی مذہبی راہنماؤں کے نظام کے اس حصے کے نمائندہ ہیں جس نے اصلاح پسندوں کو جمہوریت اور انسانی حقوق جیسے معاملات پر گفتگو میں شامل کیا ہے۔

ان چاروں مختلف مفکرین میں سے کوئی بھی عموماً انگریزی میں نہیں لکھتا ہے۔ لہٰذا ان کے خیالات کو جاننے کے لیے ان کا مندرجہ ذیل خلاصہ کلام پیش کیا جا رہا ہے۔ مغربی صحافیوں اور مفکرین کی تشریحات کے مقابلے میں ان کے خیالات کی یہ ایک منفرد جھلک ہے۔ یقیناً اور بھی کئی اہم آوازیں اور تناظر موجود ہیں، تاہم پیش کردہ مواد اگرچہ مختصر ہے لیکن اسلام اور کثرتیت کے بارے میں ان نظریات کا اجمالی جائزہ ہے جو آج کل اسلامی دنیا میں پروان چڑھ رہے ہیں۔

انتہا پسندی تشدد سے جنم لیتی ہے — جمال البناء

ظالمانہ فوجی حکومت کا آغاز ایسے متشدد گروہوں کو جنم دینے کا باعث بنا ہے جو طاقت کے استعمال اور براہ راست اقدام کو اپنا وطیرہ بنائے ہوئے ہیں۔ کئی ایک اسلامی تحاریک کے مرشد سید قطب تھے جو جہاد کو حاکمیت الٰہیہ کے نفاذ اور حاکمیت الٰہیہ کو تمام انسانی قوانین کے مقابلے میں درست قانون قرار دیتے تھے۔ تحاریک اسلامی کا اپنایا ہوا رویہ فقط اسلام کی مسخ شدہ تشریح ہی کے باعث نہیں تھا، اس کے نفسیاتی اور سیاسی اسباب بھی ہیں اور جابرانہ عسکری اقتدار نے بھی اس میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

جمال عبدالناصر کے قید خانوں میں ۱۹۵۰ء اور ۱۹۶۰ء کی دہائیوں میں ہونے والا جسمانی تشدد اکثر نوجوان قیدیوں کو یہ سوچنے پر مجبور کرتا تھا کہ ایسی حکومت جو اس قسم کے اقدامات کرے، کسی مسلمان حکومت کے بجائے کفریہ حکومت ہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ناصر کی جیلوں میں دوسروں کو کافر قرار دینے کے رویے کی داغ بیل پڑی اور کافر قرار دینے کا یہی رویہ نوجوان اسلام پسندوں کے جذبہ جہاد کی وجہ بنا۔

اخوان المسلمین کے مقید ساتھیوں نے جوان نوجوانوں کے مقابلے میں سمجھدار اور زیادہ لچکدار

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مزاج رکھنے والے تھے، ان خیالات کو ختم کرنے کی کوشش کی لیکن کچھ حاصل نہ ہوا۔ ایک کتاب بعنوان ''مبلغ نہ کہ منصف'' شائع کی گئی لیکن اس سے قبل ہی ہونے والا نقصان ہو چکا تھا۔ انہیں جس سفا کانہ تشدد کا نشانہ بنایا جاتا تھا اس نے ان کے مزاج میں بے اطمینانی اور ڈھیٹ پن شامل کر دیا تھا۔ ان میں سے جیل سے چھوٹنے والے پہلے فرد شکری مصطفیٰ نے بدعت اور ہجرت کے فورم کی بنیاد رکھی۔ جس نے جامعۃ الازہر کے ایک ممتاز مذہبی مفکر کو اغواء کیا اور پھر اس وقت جبکہ حکومت نے اس کی رہائی سے متعلق ان کے ساتھ معاملات کرنے سے انکار کر دیا تو اس کو قتل کر دیا۔

اس منحوس چکر کے نتیجے کے طور پر ریاستی دہشت گردی کا جواب تنظیموں نے بھی تشدد سے دیا جس سے ریاست کی جانب سے دہشت گردی بڑھی اور اس طرح تشدد کے دائرے میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔

اصلاح کی دعوت — محمد شہرور

ایسی اسلام پسند جماعتوں کے بارے میں کوئی تصور قائم کرنے کے لیے جو تشدد اور دہشت گردی پر عمل کرتی ہیں کئی مغربی تجزیہ نگاران کے لیے بالآخر ''بنیاد پرست تحریکوں'' کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ لیکن عیسائیت کے برعکس جہاں بنیاد پرستی کو ایک واضح عقیدے کے طور پر بیان کیا گیا ہے، اسلام میں بنیاد پرستی کی روایت نہیں ہے۔ اسی طرح اسلامی بنیاد پرستوں میں تشدد یا دہشت گردی کے حوالے سے پایا جانے والا کوئی بھی مبالغہ صرف مسلح سیاسی تحاریک کا طرز عمل ہے جس کا عباداتی، قانونی یا اخلاقی اسلام سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

یہ سیاسی تحاریک اسلامی اور یورپی تجربہ زندگی کا اختلاف ظاہر کرتی ہیں۔ تاریخی اعتبار سے مسلم معاشروں میں حاکمین نے مذہب کو سیاسی اختیار کے تابع بنالیا تھا۔ سیاسی سطح پر اختیار کے درست ہونے کا جواز حاکمین کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت کی طرح کرنے پر مبنی تھا۔ اس رویے کو مزید تقویت تقدیر کے بارے میں پہلی صدی سے جاری عقیدے سے ملی۔ اس تصور کا جواز کہ انسان کی زندگی کا دارومدار اس کے مقدر پر ہے، قرآن سے بھی ملتا ہے مثلاً ''اللہ کی منشا کے بنا کچھ نہیں ہوسکتا''۔ اور اس طرح کی کہاوتیں جیسے ''جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دیا گیا ہے، تم اس کو ضرور پالو گے''۔ اللہ اور رسول کی اتباع حاکم کی اتباع

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

سے الگ کی جا سکتی تھی لیکن یہ بات کئی علماء نے مکمل طور پر نظر انداز کر دی تھی جو کہ پہلے ہی با اختیار حکمرانوں کی ملازمت میں تھے۔

۱۹۲۴ء میں ترکی کے نئے حکمران مصطفیٰ کمال اتاترک نے خلافت کا خاتمہ کر دیا جو کہ تمام امت مسلمہ کی سرپرستی کی علامت تھی۔ خلافت کے خاتمے کے ساتھ ہی آمریت کی اطاعت کا جواز ختم ہو گیا۔ اکثر لوگوں کے ذہن میں کوئی متبادل جواز اب تک پیدا نہیں ہوا ہے اور یہی بات آج کل کی اکثر عرب اور مسلم دنیا میں قائم بے سروپا حکومتوں میں پائی جاتی ہے۔ کمزور جواز حکومت کو مضبوط بنانے کے لیے اسی مذہبی رویے کی طرف لوٹنے اور اپنی ریاستوں میں مفتی اعظم اور شیخ الاسلام مقرر کر کے اپنی حکومت کے درست ہونے کی دلیل مہیا کرنے کے سوا حکمرانوں کے پاس کم ہی راستے ہوتے ہیں۔ ہم یہ چیز انقلاب ایران میں دیکھ سکتے ہیں جہاں ولائت فقیہ کی صورت میں استبدادی حکمران اپنے انقلابی جواز کا دعویٰ کرتے ہیں۔ اعلیٰ ترین اختیارات کا حامل یہ گروپ پارلیمنٹ میں کسی بھی قانون سازی کو روک سکتا ہے۔

حکومت کا غیر مذہبی جواز حاصل کرنے میں ناکامی کے علاوہ مغرب اور اسلامی دنیا میں ایک اور فرق شریعت کے نظام کا ہے۔ یہاں شریعت سے مراد وہ آیات قرآنی ہیں جو امور حکمرانی اور نظام انصاف سے آگاہ کرتی ہیں اور جن میں سماجی، خانگی و ذاتی معاملات، جرم و سزا اور مالی اور تجارتی لین دین کے معاملات شامل ہیں۔ فی الواقع یہ تمام معاملات ریاست کے دائرہ کار سے منہا کر دینا ناممکن ہے۔ عبادات (نماز، روزہ، حج وغیرہ) کے برعکس شادی بیاہ، طلاق، وراثت، وصیت، تعلیم، متبنی بنانا، خرید و فروخت اور قرض دینے اور لینے جیسے معاملات کو سیاسی اختیار سے جدا کر دینا ممکن نہیں ہے۔ یہ مسلم دنیا کا ایک منفرد مسئلہ ہے۔

تیسرا فرق عالم اسلام کا دنیا کے بارے میں ایک دقیانوسی تصور ہے۔ آج جبکہ یورپ نے دنیا کے بارے میں انجیل کے خیالات سے چھٹکارا پا لیا ہے۔ عرب دنیا میں ابھی تک جدید تنقیدی ملاحظات کے باوجود قرآن و حدیث اور اسباب نزول کے بارے میں قدیم فرسودہ شروح رائج ہیں۔ کبھی کبھار ایسے فتوے بھی سننے میں آتے ہیں جو ان لوگوں کے خلاف ہوتے ہیں جن کے خیال میں زمین گول ہے۔ مسلم دنیا کے مخصوص مسائل بھی انہیں تنگ نظر اور خود فریبی پر مبنی قانونی فیصلوں کی پیداوار ہیں۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

یہ بحران اسلامی دنیا کے مختلف جدا مکتبہ ہائے فکر کی وجہ سے مزید بھڑکتا ہے۔ جس میں ہر ایک کا اپنا متن و قانون ہے اور علماء نے ایک عظیم الجثہ لیکن مختلف فیہ اثاثہ چھوڑا ہے جس کی نہ تو اصلاح کی جاسکتی ہے اور نہ تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ اسی اثناء میں بنیاد پرست اسلامی تحاریک جن کی مختلف بنیادیں ہیں، اپنی ہی تشریحات کو نافذ کرنا چاہتے ہیں اور اکثر اپنے تنگ نظر خیالات کے ذریعے موجودہ مکاتب فکر کی جگہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔

جدّت پسندی کی شکست

مسلمان دنیا کی آزاد خیال تحریکوں نے مغربی نمونہ اپنایا ہے اور اسلامی قانون اور قانون سازی کو رد کر دیا ہے۔ یہ تحاریک اسلام کے نظریہ توحید کو رد نہیں کرتیں، اس کے وحی الٰہی ہونے کا انکار نہیں کرتیں، اس کے نظام اخلاق و افکار کی منکر نہیں ہیں اور عبادات (نماز، روزہ، والدین کے ساتھ حسن سلوک اور چور بازاری سے پرہیز وغیرہ) کو بھی نشانہ تنقید نہیں بناتے ہیں۔ البتہ یہ حضرات مذہب اور ریاست کو جدا کرنے کے خواہش مند ہیں، ان کا نشانہ فقط شریعت اور اسلامی قانون ہے۔ تاہم یہ آزاد خیال کبھی عرب مسلم دنیا میں کوئی مقام نہ بنا سکے کیونکہ وہ نظریاتی اور فلسفیانہ ہتھیاروں سے لیس نہیں تھے۔ یہ اسلامی اور عرب معاشروں میں تھوڑی بہت جگہ بنانے میں بھی ناکام رہے۔ نتیجتاً آزاد خیال لوگ مغرب زدہ رہے، عوامی حلقوں سے دور!!

اشتراکی تحریکوں کا حال تو ان سے بھی بدتر تھا۔ انہوں نے ایک غیر مشروط تصوراتی تاریخ سے ابتدا کی۔ ان کا مطلق العنان مسلمان حکومتوں کے رویے کی طرح کا طے شدہ مزاج تھا۔ ایک تاریخی دور سے دوسرے تاریخی دور تک معاشروں کی ایک متعین انداز میں ترقی اور بالآخر اس کو اشتراکیت کی سطح پر لانے کے مقصد نے اشتراکیوں کو عالم اسلام میں ہٹ دھرم قرار دے دیا۔ مزید برآں ان کا دہریت کی طرف جھکاؤ نے مذہبیت ہی کو تار تار کر دیا۔ حالانکہ قابل گرفت وہ مذہبی گروہ تھے جنہوں نے لوگوں کی خواہشات اور سوچ پر پہرہ بٹھا رکھا تھا۔ اشتراکیوں کے مذہب مخالف دلائل، جو دراصل جاگیردارانہ نظام کے خلاف تھے، ایسا ہی عمل تھا گویا کسی رہٹ کے پراگندہ ہونے کی وجہ سے کنویں ہی کو پاٹ دیا جائے۔

عرب دنیا نے وہ قومی تحریکیں بھی دیکھی ہیں جنہوں نے ترقی، جدت پسندی اور سائنس کے بارے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

میں قطعی اور ہٹ دھرم رویہ اپنایا۔ یہ تحریکیں عرب اتحاد، اشتراکیت اور ترقی پسندی کے فدویانہ قسم کے نعرے لگاتی تھیں۔ قوم پرستوں نے رجعت پرستوں کی نفی کرنے کے لیے اپنے مخصوص جذبات کا پرچار کیا۔ انہوں نے کافر، دہریے اور مشرک جیسے اسلام پسندوں کے نعروں اور اشتراکیوں کے سرمایہ دار، توسیع پسند اور عوام دشمن کے جواب میں قدامت پرست، ٹاؤٹ اور غدار جیسے الفاظ استعمال کیے۔ لیکن انہوں نے بھی اشتراکیت کے خلاف اپنی روش رکھی۔

۱۹۶۷ء کی عرب اسرائیل جنگ نے ان تمام تحاریک کا پول کھول دیا۔ شکست کے ایام میں یہ ثابت ہوگیا کہ عرب دنیا کی جدیدیت علم برداروں نے اپنے وعدوں سے انحراف کیا تھا۔ بالخصوص قومیت کے نظریات رومانوی اور نظریاتی حیلے کے طور پر سامنے آئے جن میں ریاست، معاشرے اور بدلتی ہوئی ضروریات کے حوالے سے کوئی واضح لائحہ عمل موجود نہیں تھا۔ نتیجتاً طاقت کا استعمال کرنے والی مطلق العنان حکومتیں وجود میں آئیں۔

اسلام پسندوں کا ردّعمل

اس تاریخی پس منظر کو سامنے رکھتے ہوئے ہم اسلامی تحاریک کو بہتر طور پر سمجھ سکتے ہیں۔ یعنی مسلمانوں کے وہ گروہ جو از سرِنو ایک اسلامی ریاست کے قیام کے خواہاں ہیں۔ یہ تحریکیں ۱۹۶۷ء کی جنگ کے دور میں قابلِ توجہ بنیں جبکہ اسلامی نشاۃ ثانیہ اور اسلامی حکومت کا از سرِنو قیام جیسے نظریات ہر جگہ پھیلے ہوئے تھے۔ اس کے باوجود روایتی اسلامی کتب پر انحصار کی وجہ سے اسلام پسند بیسویں صدی کے حالات کے مطابق ریاستی اور سماجی نظام کی تشکیل کے لیے کوئی جامع منصوبہ پیش نہیں کرسکے۔

اسلامی تحریکوں کے پاس سائنسی اور معلوماتی ترقی کے مؤثر دور میں کوئی بصیرت افروز لائحہ عمل ہی نہیں تھا۔ ایسے میں جدید شہری تہذیب، آزادیٔ اظہار، انتخابات، آئین کی بالادستی کا نظریہ، رائے شماری کے طریق، خواتین کے معاشی حقوق، منتخب شدہ سیاسی ادارے وغیرہ کا کیا تذکرہ کیا جائے۔ تاریخ اسلامی کا علمی ذخیرہ عدالتوں کے اس آئینی طریقے کے بارے میں مکمل طور پر خاموش تھا۔ جو حکمران کے حقوق و فرائض کی واضح تشریح کرتا ہے کہ وہ کیسے منتخب ہوگا اور اس کی حکومت کی مدت کیا ہوگی۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اسی طرح اسلامی تعلیمات نے شخصی آزادی کا کوئی ایسا خاکہ پیش نہیں کیا جیسا کہ آج اس کا تصور موجود ہے۔ آزادی اظہار کی بھی اسلام میں محدود سی اجازت ہے۔ روایتی طور پر افراد صحیح معنوں میں شخصی آزادی اظہار نہیں رکھتے تھے۔ انہیں اپنے مطلق العنان حکمرانوں اور فقہا کی رائے پر چلنا پڑتا تھا۔ رائے دہی کے بجائے مذہبی فیصلے اسلامی قانون کی بنیاد ہیں۔

مزید برآں جب سیاسی اقدامات کے اصول وضوابط کا معاملہ ہو تو یہ واضح ہے کہ اسلامی تحریکوں کے کارکنان اپنے مذہب سے گہری وابستگی رکھنے والے اور بالعموم سادہ لوح ہیں۔ یہ سادگی ہی دراصل اسلام پسندوں کی اس عام سیاسی کمزوری کا حصہ ہے جو ان کے دہشت گری اور اشتعال انگیزی کی طرف مائل ہونے کی وجہ ہے۔

شومیٔ قسمت کہ اسلامی تحریکیں سیاست اور ارتداد کو اسلام اور ایمان کو، عمل صالح اور حقوق کو اور جہاد اور مسلح جدوجہد کے مفہوم کو باہم خلط ملط کرتی ہیں۔ مذہب کا اچھی مثالوں سے تاثر دینے کے بجائے جیسا کہ قرآن میں اس بارے مین ہدایت دی گئی ہے، یہ اس کا تلوار کے ذریعے پرچار کرتی ہیں۔ یہ قرآنی نصوص کو توڑ مروڑ کر پیش کرتی ہیں جیسے کہ ان کا مارنا (قتل) اور جہاد کرنا (قتال) کو لازم وملزوم سمجھنا اور اسے اسلام کا بنیادی اصول ماننا۔ یہ ابہام موجودہ دور میں ریاست اور معاشرے کے بارے میں ان اسلامی تصورات سے ناواقفیت کی وجہ سے جنم لیتے ہیں جہاں جہاد، تقویٰ اور مباحث کو متعین مقام دیا جاتا ہے۔ غلط فہمیوں اور مخمصوں کا شدت پسند مذہبی سرگرمیوں سے اشتراک با آسانی ایک ظالمانہ مسلح اشتعال انگیزی کی طرف لے جا سکتا ہے جس میں امریکہ میں ہونے والے ۱۱ستمبر کے حملوں جیسا تجاہلانہ قتل عام بھی شامل ہے۔

اسلامی سیاسی تحریکوں کی اشتعال انگیزی کی طرف جانے کی ایک وجہ بجائے خود سیاسی بھی ہے۔ اس رجحان کا سبب دراصل مطلق العنان مسلمان حکومتوں کی طرف سے کیے جانے والا تشدد ہے، جس کا بنیادی ردعمل جوابی تشدد کی صورت میں نکلتا ہے۔ ان حکومتوں کے قیام کا کمزور جواز ان تحریکوں کو شدت سے حزب اختلاف میں شامل ہو جانے پر مجبور کرتا ہے۔ ان کا غیر مفاہمانہ رویہ تشدد کی ایک ایسی فضا کے قیام میں مدد دیتا ہے جو پہلے سے متشدد مزاج اسلامی تحریکوں کے جذبہ اشتعال کو مہمیز کرتی ہے۔ غربت، بے روزگاری،

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دولت کی غیر منصفانہ تقسیم، طبقاتی مراعات اور نظر انداز کیا جانا، بنیاد پرست اسلامی تحریکوں کی حمایت میں اثر انگیز عناصر کے طور پر کام کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں آخری بات یہ ہے کہ اسلام پسند عناصر کا تشدد کی طرف رجحان اس بات سے بھی تقویت پکڑتا ہے کہ جدیدیت کی حامی تحاریک بالعموم ناکام ہیں۔ عرب دنیا مسلمانوں کے جس علمی اور ثقافتی خلا کا شکار رہی ہے اسلام پسند عناصر اسے پُر کرتے ہوئے نظر آ رہے ہیں۔ لیکن اسلامی تحریکیں ماضی بعید کے تجربات اور حکمتوں ہی پر تکیہ کیے ہوئے ہیں۔ سرکاری مذہبی ادارے جو قدامت پرستی کے ہاتھوں معذور ہو گئے ہیں۔ اس مسئلے میں زمانہ ماضی کو عرب اذہان میں رائج کر دینے کے باعث صورت حال کو مزید خراب کر رہے ہیں۔ نتیجتاً سیاسی تشدد کے جواب میں جہاد کا بنیادی خاکہ زمانہ ماضی سے لیا گیا ہے۔

اسلام کی از سر نو تشریح

اسلامی تحاریک کے مستقبل کی امیدیں اس وقت تک دھندلی ہیں جب تک کہ وہ موجودہ دور کے تناظر میں ریاست اور معاشرے کے بارے میں کوئی اسلامی تصور تشکیل نہ دیں جو اظہار، سیاسی مخالفت، سیاسی طاقت کے استحقاق، حق رائے دہی، رائے شماری، شورائی نظام، عقیدے کی آزادی اور اجتماعی انسانی حقوق بالخصوص حقوق نسواں کے بارے میں آزادی مہیا کرے۔ اس چیز کو وجود میں لانے کے لیے اسلامی اصطلاحوں میں فقہی استدلال کو مکمل طور پر تبدیل کرنا پڑے گا۔ اس تبدیلی کے آنے تک شہری سماج اور ریاستی اداروں کے ڈھانچوں میں بنیاد پرست قوتوں کے طاقت حاصل کر لینے کے خطرات منڈلاتے رہیں گے۔

مجھے اس نکتے کی وضاحت کرنے دیجیے۔ اسلامی قانون کا بنیادی متن تو وہی ہے جو افغانستان کی طالبان جیسی تحریک نے استعمال کیا ہے۔ ہمیں اس متن کی وضاحت کے جدید طریقہ ہائے کار اختیار کرنا ہوں گے۔ لیکن اس میں بڑی رکاوٹیں ہیں۔ جب عظیم مصری مفکر شیخ محمد عبدہٗ نے انیسویں صدی کے اواخر میں اسلامی قوانین کی از سر نو تشریح کرنے کا خیال ظاہر کیا تو انہیں روایت پسندوں کی جانب سے عوامی سطح پر بدنام کر دیا گیا جو ان کو (شریعت کا) راج مستری اور مغربی ٹاؤٹ کہتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

حقیقت حال کو اسلامیانا (اسلام کے مطابق تشکیل کرنا) دراصل ایک سماجی سطح کا عمل ہے۔ ایک مہذب معاشرہ، مہذب اور ایک بدوی معاشرہ، بدوی اسلام پیش کرتا ہے۔ شائد مسلم دنیا کا سب سے کمزور پہلو ایسی سیاسی تحاریک کا سامنے آنا ہے جن کا مقصد مسلمان معاشروں کو نفاذِ شریعت کے خوشنما نعروں کے زیر اثر پسماندہ تاریخی دور کی جانب دھکیلنا رہا ہے۔ نفاذ شریعت تو ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ اس کی آڑ میں شخصی اور آمرانہ اقتدار کے وہ تمام مفادات چھپے ہوئے ہیں جو مسلم ممالک میں لائحہ عمل مرتب کرتے ہوئے سامنے رکھے جاتے ہیں۔ یاد رہے کہ طالبان کی حکومت میں افغانستان دنیا میں سب سے زیادہ منشیات پیدا کرنے والا ملک بن گیا تھا۔ مسلمان بھی اگر احتساب کے بغیر طاقت حاصل کر لیں تو وہ اس سے دنیا کی کسی بھی اور قوم کی طرح متاثر ہو سکتے ہیں۔

اسلامی تحریکیں اس لیے معرض وجود میں آئیں کہ عرب دنیا میں جدیدیت کے علم برداروں نے اپنے وعدے سے انحراف کیا چنانچہ ایک نعم البدل کی اشد ضرورت پیدا ہوگئی۔ روایت پسندی کا اسلامی ورثہ یہ نعم البدل مہیا کرنے کے لیے از بس تیار تھا مگر یہ برائے نام نشاۃ ثانیہ بھی روایت پرستوں کی فرائض اور عبادات کی حد تک رہنے والی محدود سوچ سے آگے نہ بڑھ پائی مثلاً نماز روزہ، حج، مسجد میں زیادہ اوقات صرف کرنا، مردوں کا داڑھی رکھنا اور خواتین کا پردہ کرنا وغیرہ (خواتین کا پردہ ایک سیاسی شناخت اور نشان کے طور پر بھی استعمال ہوا۔ عسکریت پسندوں نے اسے پھیلایا اور حکمران طاقتوں نے اسے تسلیم کرتے ہوئے اس کی اس حد تک حوصلہ افزائی کی جب تک کہ وہ لوگوں کو ان کے حقیقی مسائل اور شکایات سے غافل رکھ سکے)۔

حکمرانوں پر اثر انداز ہو سکنے والے اقدامات میں آئین سازی کے نئے تصورات، حکمرانوں کا احتساب، اور حکومت پر عوام کے حقوق وغیرہ شامل ہیں۔ لیکن یہ تصورات روایت پرستوں کے موروثی مزاج کا حصہ نہیں تھے۔ چنانچہ روایت پر زور دے کر حکمرانوں نے روایت پرستوں کی اس کمی کا فائدہ اٹھایا۔ ان کے سرکاری مذہبی اداروں کی طرف سے روایت پرستوں کی اعانت کی جاتی جو اسلامی تعلیمی اداروں کی مالی امداد اور اسلامی مواد کی کثیر تعداد میں اشاعت کا اہتمام کرتے تھے۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کس کی شریعت؟

وہ اسلامی روایات جو معاشرتی لین دین اور انفرادی معاملات پر گہرا اثر ڈالتی ہیں ان میں بھی مختلف فقہی اور دستوری مکاتیب فکر میں اختلاف نظر آتا ہے۔لیکن اس سے مذہبی دانشوروں کے بھاری بھر کم مصنوعی علمی خیالات اوران کے درمیان پائے جانے والے اختلاف رائے کا اظہار ہوتا ہے جو ایک غیر حقیقت پسندانہ شرعی جواز بھی مہیا کرتا ہے۔مثلاً ماہ صیام کے آغاز کے تعین پر ہونے والے مباحث یا یہ کہ کن خاص حالات میں بنکوں کے قرضے پر سود جائز ہے یا چوری کے واقعات میں شریعت کے احکامات کا بیان (کہ کیا چور کا ہاتھ حقیقی معنوں میں کاٹا جائے یا اجمالی طور پر ہاتھ کاٹنا مراد ہے۔اگر واقعی ہاتھ کاٹنا ہے تو ہاتھ سے بازو کا کون سا اور کتنا حصہ مراد ہے؟) وغیرہ آتے ہیں۔

بعض لوگ یہ نکتہ اٹھائیں گے کہ نفاذ شریعت کا ایک عام طور پر لگایا جانے والا نعرہ مذہبی، سیاسی اور ثقافتی روشن خیالی کے متضاد ہے۔اس سوال کا جائزہ لینے کے لیے ہمیں پہلے اس بات کو واضح کرنا ہوگا کہ شریعت سے درحقیقت کیا مراد ہے؟ اگر ہم اس سے قرآن کے الٰہی احکامات اور احادیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم مراد لیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ خدا اور اس کا رسول ایک اسلامی ریاست میں روشن خیالی کے مخالف ہیں۔مگر یہ ناممکن ہے اس لیے کہ اللہ نے قرآن میں یہ بات وضاحت سے اور واشگاف الفاظ میں فرمادی ہے۔''دین میں کوئی جبر نہیں۔تحقیق ہدایت اور گمراہی کا فرق واضح کردیا گیا ہے''۔اور یہ کہ ''اللہ چاہتا تو روئے زمین پر سبھی کو ایمان والا بنادیتا! پس کیا تم لوگوں کو ایمان لانے کے لیے مجبور کروگے''؟

لہٰذا اب سوال اس بات کا ہے کہ شریعت کی اصطلاح کی تصوراتی حدود کی تعریف کیا قرار پائے گی؟ کس طریق کار کے مطابق قرآن سے باہر کے پیش کردہ قوانین کو تسلیم کیا جائے؟ کتب احادیث (آپؐ کے فرمان اور زندگی کے بارے میں کتب) جو فقہاء نے مدون اور تحریر کی ہیں ان کی کیا حیثیت ہوگی؟ دراصل موجودہ دور میں شریعت کا حصہ سمجھی جانے والی کئی باتیں تاریخی الفاظ ہیں۔جو انسانی کوشش کا نتیجہ ہیں۔مزید براں یہ متن دراصل اس دور میں پیش کیے گئے فقہی دلائل اور ثبوت کی روشنی میں لکھے گئے ہیں اور یہ بھی تاریخی انسانی کوششوں کا نتیجہ ہیں۔اگر ان تمام بیان کردہ باتوں کا جو کہ ان تاریخی حوالوں میں درج ہیں، پرچار کرنا مقصود ہو تو پھر ہم عرب اور مسلمان ممالک میں ایک طالبان دور کا مشاہدہ کریں گے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اگر چہ اس کی کئی مقامی طور پر بننے والی اقسام ہوں گی۔ یہ تناظر اپنے اندر روشن خیالی اور شہری معاشرے کے لیے عظیم خطرات رکھتا ہے۔ یہ رویہ معاشرے کو تیزی سے ماضی کی طرف واپس لے جانے والا بھی ہے۔ ماضی سے مراد نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا زمانہ نہیں بلکہ قرون اولیٰ کا مسلمان معاشرہ ہے۔

ہم نے اگر شریعت کو قرآن وحدیث کے بیان کردہ اصولوں کے مطابق ایک طرز حکومت اور دیگر معاملات میں ایک عمومی ہدایت مہیا کرنے والی چھتری سمجھا ہوتا جو زمان ومکان کے اعتبار سے ترقی کرتی تو یہ ایک بالکل مختلف بات ہوتی۔ صرف اسی طرح ہم ایک ایسی شریعت کے حامل ہو سکتے تھے جو روشن خیالی اور شہری معاشرت سے متصادم نہ ہوتی۔ ہمیں صرف وہی کرنے کی ضرورت ہے جو ہمارے بزرگوں نے کیا تھا اور وہ کام ہے قرآن وحدیث کا اپنے وقت کے تقاضوں کے مطابق مطالعہ کرنا۔ ہمیں بھی قرآن وسنت کا از خود مطالعہ کرنا چاہیے تاکہ وہ ہمیں شریعت کے بیان اور تدوین فقہ کے بارے میں نئے اصول فراہم کر سکے۔ یہ اصول مندرجہ ذیل بنیادوں پر مرتب ہونے چاہییں:

- **اعلیٰ معیار (اخلاقیات اور اقدار کے نظام)**: ان میں نوح علیہ السلام کے زمانے سے لے کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت تک اضافہ ہوتا رہا۔ ان میں طے شدہ عالمی انسانی اقدار شامل ہیں جیسے کہ والدین کی عزت، خودکشی سے پرہیز، ایفائے عہد اور تجارتی دیانت داری وغیرہ۔
- **حقوق اور عبادات**: یہ ایمان کا قلب ہیں۔ لیکن نماز، روزہ اور حج میں تبدیلی اور اختلاف آتا رہا۔ نماز قریباً تمام مذاہب میں پائی جاتی ہے اور روزہ مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی طرح ریاست کو بھی حقوق اور عبادات میں اور مختلف عبادت گاہوں (مساجد، کلیسائیں اور ہیکل وغیرہ) کی موجودگی کے اختلاف کو قبول کرنا چاہیے (درحقیقت اکثر مسلم ممالک میں یہی صورت حال ہے)۔
- **تشکیل شریعت**: ایک ایسی شریعت کی تشکیل جو عقیدۂ توحید اور عبادات کے علاوہ تمام تر دینوی امور کا احاطہ کرے اور انسانی معاشرے کی ہر دم ترقی اور تبدیلی میں اسے قابل اطلاق بنا سکے۔
- **طریق نجات**: ہم نے اسلامی تحاریک کے نظریات کے ارتقاء پر نظر ڈالی ہے لیکن ایک آخری نکتہ اب بھی باقی ہے۔ ان کی منزل کیا ہے؟ اس کا جواب اس قدر آسان نہیں جیسا کہ نظر آتا ہے۔ مثلاً کیا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

طاقت کا حصول ان کا منتہا ہے؟ میں انصاف، مساوات، شورائیت (مشورہ)، بدعنوانی کے خلاف جدو جہد اور جان و مال کے تحفظ جیسے نعروں کی سچائی کو مان لوں گا۔ لیکن ان نعروں کی متعین کردہ منازل کو حاصل کرنے کے لیے ایک لائحہ عمل کی ضرورت ہے جسے بتدریج کامیابی تک پہنچانے کے لیے کچھ واضح بنیادی اقدامات۔ ظاہر ہے کہ دینِ اسلام کے اصل اثاثے اور روایات اس لائحہ عمل کے لیے ناکافی ہیں۔

بنیاد پرستی دراصل روایات پر زور دینے اور ان میں موجود اختلافات اور بے قاعدگیوں کے باجود صرف اسی کو اپنانے سے شروع ہوتی ہے۔ اسی طرح یہ لوگوں کو ماضی اور اس کی تمام جزئیات کی طرف واپس دھکیلنے پر مائل ہوتی ہے۔ جبکہ حال کو اس کے تمام ثمرات کے باوجود ترک کر کے کسی تبدیلی کے بغیر پرانی روایات اور ان کی پرانی تعبیرات سمیت نفاذ کا مطالبہ کرتی ہے۔

اگر اسلام پسندوں کی منزل طاقت کا حصول نہیں بلکہ اس میں اشتراک ہے تو پھر وہ کس سے حکومت کرنے میں تعاون کریں گے؟ قوم پرستوں سے یا آزاد خیال حلقوں سے؟ یا وہ خود کو کسی سرکاری مذہبی ادارے میں ڈھالیں گے جس کے نتیجے میں ایک ایسا نظام وضع ہو سکے کہ انہیں ایک مستقل کردار میسر آ سکے۔ تحاریک اسلامی کے پاس دو راستے ہیں، طاقت پر اجارہ داری یا شراکت اقتدار تا کہ آئندہ تحریکوں، خواہ وہ مذہبی ہوں یا غیر مذہبی، کے لیے راستہ کھلا رہے۔ اسی پہلو سے یہ متعین ہو سکے گا کہ آیا تباہ کن اشتعال انگیزی اب بھی کرداروں اور مقامات میں معمولی تبدل کے ساتھ آ سکتی ہے یا نہیں۔

لبنان میں جاری ایک تجربہ ایک اسلامی تحریک حزب اللہ کا ہے جو اپنے نظریات اور ڈھانچے کے اعتبار سے بنیاد پرست ہے۔ پھر بھی وہ یہ ثابت کرنے کی کوشش کر رہی ہے کہ دہشت گردی درست راستہ نہیں ہے اور تشدد کا استعمال فقط قابض قوتوں، نو آبادیات اور مغلوبیت کے خلاف کیا گیا تھا۔ حزب اللہ کسی شرمساری کے بغیر معاشرے کی میں اپنی سیاسی اور سماجی ساکھ کو مستحکم کر رہی ہے۔ البتہ اس بات کی پیشن گوئی نہیں کی جا سکتی کہ وہ قوم پرست طاقتوں اور دیگر سیاسی دھڑوں سے کس حد تک تعاون کرے گی۔ پھر اس بارے میں بھی کچھ کہنا ممکن نہیں کہ وہ ان بیرونی طاقتوں سے کیسے معاملہ طے کرے گی جو بطور مجموعی کسی بنیاد پرست مذہبی جماعت کے فعال ہونے کو برداشت نہیں کر سکتیں (ایک اور لازمی سوال یہ بھی ہے کہ کیا حزب اللہ ایران کے اثر سے جو کہ اس کا سب سے بڑا مالی معاون اور مددگار ہے، نکل سکے گی؟)۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

عرب اسلامی دنیا کے لیے مرکزی توجہ کا پہلو یہ ہے کہ دورِ حاضر کے تناظر میں قرآن وسنت کا از سرنو مطالعہ کرنے کی ضرورت کا احساس اجاگر کیا جاسکے تاکہ معاصرانہ مسائل کے حل پر گرفت حاصل ہوسکے۔ یہ عمل قرون اولیٰ کے فقہاء کی آراء سے آزاد ہونا چاہیے۔ ان کی واجب الاداتکریم اور تقدس کے ساتھ! یہ امر اس لیے ضروری ہے کہ ہم کھلے ذہن کے ساتھ عہد حاضر میں اس کا مطالعہ کرنا چاہتے ہیں۔ اپنے بارے میں محتاط اور ناقدانہ طرزِ عمل ہی دہشت گردی اور تشدد کے خلاف ایک بند ہے۔ بلاشبہ یہ عمل دشوار گزار ہے اور ابھی ابتدائی مراحل میں ہے چنانچہ اس بارے میں قائم کی جانے والی امیدیں انتہائی تصوراتی ہیں۔ اس سے قطع نظر کہ یہ تجربہ اچھا ہوگا یا برا، مجھے نجات کا کوئی اور راستہ نظر نہیں آتا۔ (بوسٹن یونیورسٹی کے اشرف-ن-الشریف نے عربی سے ترجمہ کیا)

خیال اور مذہب کی آزادی — محسن کادیور

اسلام میں تحمل کا مقام سمجھنے کے لیے ہمیں اس بات کا جائزہ لینا ہوگا کہ ہم اسلام میں آزادی اظہار سے کیا مراد لیتے ہیں؟ میں یہ دلیل پیش کرتا ہو کہ نظریے، اظہار اور عقیدے کی آزادی نہ صرف اسلام اور مسلمانوں کے لیے مفید ہے بلکہ یہ بنیادی دینی اصولوں میں بھی ضروری قرار دی گئی ہے۔

اسلام دنیا کے تین عظیم مذاہب میں سے ایک ہے لیکن بارہا یہ خیال ظاہر کیا گیا ہے کہ یہ ایک ایسا مذہب ہے جو اختلاف رائے کو تسلیم نہیں کرتا۔ اسلام کی تاریخ میں قرآن کا متن، نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت، دین میں مجتہدین کا رویہ اور علمائے امت کا کسی مسئلے پر اجماع (اتفاق رائے) زمان ومکان کی قید سے بالاتر ہوکر مستقل ماخذ مانے جاتے ہیں۔ چنانچہ اسی بنیاد پر انہیں ناقابل تنقید سمجھا جاتا ہے جبکہ اس رائے کے حامل افراد مذہبی جواز، جسے وہ حکمت (wisdom) کا نام دیتے ہیں، پر یقین رکھتے ہیں۔ تاہم یہ حکمت انسانی ذہن سے بالاتر کوئی شے سمجھی جاتی ہے۔

اسلام کے مطابق تمام مسلمان اپنے مذہب پر عمل کرنے میں، اپنے مذہبی عقائد کا اظہار کرنے میں، تنہائی میں یا باجماعت عبادت کرنے میں اور اپنی اولاد کو اپنا مذہب سکھانے میں آزاد ہیں۔ انہیں دیگر تمام مذاہب پر تنقید کرنے اور اسلام کی بالادستی ثابت کرنے کا حق حاصل ہے۔ کسی شخص کو مسلمان پر اپنا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مذہب چھوڑ دینے یا اسے اپنے مذہبی تہوار منانے سے روکنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ اس بات پر مکمل اتفاق رائے پایا جاتا ہے اور اس میں ذرا سا بھی اختلاف موجود نہیں ہے۔

اس کے باوجود کسی مسلمان کو اپنا مذہب تبدیل کرنے اور عیسائیت، بدھ مت یا دہریت وغیرہ اختیار کرنے کی اجازت نہیں ہے۔ جو مسلمان اپنا مذہب بدل لے یا عرف عام میں مرتد ہو جائے وہ سخت سزا کا مستحق ہوگا۔ مسلمانوں کا وہ بچہ جو بلوغت کے بعد مسلمان رہنے کا فیصلہ کرے اور پھر اسلام ترک کردے، سزا کا مستحق ٹھہرے گا، خواہ وہ اس عمل سے باز ہی کیوں نہ آجائے۔ اس کی بیوی کو طلاق کے بغیر اس سے الگ کر لیا جائے گا اور اس کی جائیداد چھین کر اس کے مسلمان ورثاء میں تقسیم کر دی جائے گی۔ ایسا شخص بھی جس کے والدین میں سے فقط ایک مسلمان ہو، بلوغت کے بعد اسلام کے علاوہ کوئی اور مذہب اختیار کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ اگر کوئی مرد یا عورت ایسا کرے تو اس پر بھی ارتداد کی سزا کا اطلاق ہوگا اور اس سے قبل اس کو رجوع کرنے کے لیے کہا جائے گا۔ اگر وہ ارتداد پر قائم رہے تو اسے سزائے موت یا عمر بھر کے لیے قید با مشقت جھیلنا پڑے گی۔

ان سزاؤں کے جواز کے بارے میں کئی روایات ہیں جن کا اس ذیل میں بارہا تذکرہ کیا جاتا ہے۔ اہل سنت مسلمان اس بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ حدیث بیان کرتے ہیں جس میں آتا ہے ''جو کوئی بھی اپنا مذہب تبدیل کرے اسے قتل کر دو''۔ اہل تشیع اپنے چھٹے امام جعفر صادق کا وہ قول نقل کرتے ہیں جس میں مرتد کے لیے موت کی سزا کا بیان ہے۔ اسلامی نظریاتی تاریخ میں فقط چند مسلمان مفکرین نے اس پر اعتراض کرنے کی جرات کی ہے۔ مسلمان مفکرین نے اس امر کی تحقیق کرنے سے اجتناب کیوں کیا ہے؟ ایک ایسا مذہب جو اپنے ماننے والوں سے تحقیق کا مطالبہ کرتا ہو اور عقلی استدلال کرنے اور جائزہ لینے کے بعد ایمانیات کو اپنانے کا حکم دیتا ہو، بھلا کسی ایسے مسلمان کا قتل کر دینے کا حکم کیوں کر دے سکتا ہے جس نے کوئی اور ایسا عقیدہ اختیار کر لیا ہو جو اس کے ماننے والوں کے لیے اسی قدر معقول ہو جس قدر معقول اسلام مسلمانوں کے لیے ہے؟

جبر نا جائز ہے

قرآن کی ایک آیت میں آیا ہے: ''دین میں کوئی جبر نہیں یہ اور رشد و ہدایت گمراہی سے ممیز ہو گئی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہے۔ پس جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے اس نے واقعی ایسا سہارا ڈھونڈ لیا ہے جو اس سے کبھی جدا نہیں ہوگا۔۔۔۔‘‘

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ہونے کے ناطے ہم اس بات کا انکار نہیں کر سکتے کہ اللہ نے ہمیں اپنا مذہب کسی پر مسلط کر دینے سے منع کیا ہے۔ کیونکہ جبراً مسلط کیا گیا ایمان اور جبر کی اجازت نہیں ہے۔ اس آیت میں جبر کی ممانعت اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ لوگوں کو مذہب اختیار کرنے کی آزادی ہے۔ یہ آزادی دراصل دو اعتبار سے ہے، مذہب کو اختیار کرنے یا چھوڑ دینے کی آزادی۔

کوئی ایسا مذہب جو مذہبی آزادی کا منکر ہو بھلا کیسے اس بات کو تسلیم کر سکتا ہے کہ اسے آزادی سے اختیار کیا جائے اور جو لوگ اسے اختیار کر لیں ان کی آزادی سلب کر لی جائے؟ اگر لوگ سنجیدگی سے مذہب کے بارے میں سوچنے کے لیے آزاد ہیں تو یہ کہنا کہ انہیں ضرور اسلام ہی کو اختیار کرنا چاہیے، نامعقولیت ہے۔ اگر وہ آزاد ہیں تو پھر قبل از وقت کوئی بھی نتیجہ اس بارے میں نہیں نکالا جا سکتا۔ اگر ان کے پاس ایک مذہب کو تسلیم کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں ہے تو پھر وہ حقیقتاً آزاد نہیں ہیں۔ مسلمان معاشرے میں پیدا ہونے اور بالغ ہونے کی وجہ سے کسی شخص کے مسلمان ہونے اور عیسائی معاشرے میں جنم لینے اور بلوغت پانے کے باعث کسی شخص کے عیسائی ہونے میں کیا فرق ہے؟ اچھے اور قابل عمل خیالات فقط ہوش مند افراد کا ہی انتخاب ہوتے ہیں۔

جیسے کہ قرآن میں آتا ہے ’’ہم نے آپ پر کتاب (قرآن) لوگوں کے لیے حق کے ساتھ نازل کی۔ پس جو کوئی سیدھا راستہ اختیار کرتا ہے تو اپنے بھلے کے لیے کرتا اور جو کوئی برا راستہ اختیار کرے تو وہ بھی اپنا ہی نقصان کرتا ہے اور آپ کو ان پر وکیل بنا کر نہیں بھیجا گیا ہے‘‘۔ قرآن نے لوگوں کا اپنے لیے طریقہ زندگی اختیار کرنے کا حق واضح کر دیا ہے اور دنیا کے انسان اس سلسلے میں آزاد ہیں کہ وہ صراط مستقیم کو اختیار کریں یا نظر انداز کر دیں۔ کسی کا ایمان کی بنیاد پر مواخذہ یا اکرام اس دنیا میں نہیں بلکہ آخرت میں کیا جائے گا۔

بدقسمتی سے مذہبی اور نظریاتی آزادی کے موضوعات کا اسلامی تناظر میں مطالعہ نہیں کیا گیا ہے کہ مسلمان انفرادی طور پر ایمانیات کو کیسے سمجھیں۔ کسی بھی تصور کی طرح لوگ مذہبی عقائد کو بھی اختیار کرتے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہیں یا کسی ایک مذہبی عقیدے کو دوسرے کے مقابلے میں چھوڑ بھی دیتے ہیں۔ ہم عقلیت کے زمانے میں رہتے ہیں۔ لوگ ایمانیات اور عقلیات میں کوئی تضاد محسوس نہیں کرتے۔ ایمان دلائل اور اعمال سے مضبوط ہوتا ہے نہ کہ دباؤ اور طاقت کے استعمال سے۔ طاقت اور دباؤ کے نتیجے میں حاصل ہونے والا نظریہ ایک خلاف عقل تصور سے زیادہ کچھ نہیں ہوتا۔

مجھے یقین ہے کہ انسانی معاشروں میں موجود تمام تصورات اور مذاہب اس قدر عقلی اور مدلل حیثیت کے حامل نہیں ہیں اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ اسلام کے بعض مبلغین اپنے مذہب کو ان کے مقابلے میں برتر سمجھتے ہیں۔ اگر غیر مسلم یا تذبذب کا شکار مسلمان ہمارے عقائد اور دلائل کو تسلیم نہیں کرتے تو ہم پر فرض نہیں ہے کہ اپنے مذہب کی سچائی کو ان پر مسلط کر دیں۔ مذہب کے نام پر دہشت گردی اور طاقت کا استعمال بجائے خود مذہب کو بدنام کرتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی مذہب کو اختیار کرنے میں روحانی سکون اور دنیاوی خیر محسوس کرتا ہے تو پھر وہ اسے چھوڑ کر نہیں جا سکتا۔ تبدیلیاں لوگوں کو قائل کرنے سے آتی ہیں، مجبور کرنے سے نہیں۔

خیالات اور تصورات پر بند باندھنا ہمارے مسائل کا حل نہیں ہے اور بحیثیت مسلمان ہم اس بات کو نظر انداز نہیں کر سکتے کہ ہمارے نظریات کو آج کی دنیا میں دیگر نظریات کے ساتھ موجود رہنا چاہیے اس سے قطع نظر کہ ہم ان نظریات سے اختلاف رکھتے ہیں (باہمان بختیاری نے فارسی سے ترجمہ کیا)۔

اسلام اور تحمل ـــــ محمد بجنوردی

آج کل دنیا میں عدم برداشت کا عنصر بڑھ رہا ہے جو تشدد، مذہبی بنیاد پر لوگوں پر مظالم حتیٰ کہ نسل کشی تک کی وجہ بن رہا ہے۔ کبھی یہ زبان اور نسل کی بنیاد پر ہے، کبھی مذہب اور نظریہ کی بنیاد پر اور کبھی سیاسی اور سماجی سطح پر نظر آتا ہے۔ کسی بھی حالت میں یہ شیطانی اور تکلیف دہ عمل ہے۔ ہم عدم برداشت کے مسئلے کو کیسے حل کر سکتے ہیں؟ ہم مشتعل ہوئے بغیر اپنے نظریات اور عقائد دوسروں تک کیسے پہنچا سکتے ہیں؟ ہم آج کی دنیا میں تحمل کو کیسے فروغ دے سکتے ہیں؟ میں ان میں سے چند مسائل کا اسلامی نکتہ نظر سے جائزہ لینا چاہوں گا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

مسلمانوں کے اس نظریے کے مطابق کہ خدا حکم دینے والا ہے۔ اسلام میں بردباری کو حاکم کی مخلوق سے متلون مزاجی اور بے نیازی کے طور پر سمجھا جاسکتا ہے۔ اصطلاحی طور پر تحمل کی شریعت کے قوانین کے مطابق اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں وجود میں آنے والے اسلامی معاشرے کے طرز عمل کے مطابق تعریف کی جاسکتی ہے۔ مذہبی طور پر مسلمان ہر چیز کو اسلام کی دنیا پر بالادستی ہونے کے مقصد کے مطابق دیکھتے ہیں اور اسی لیے وہ جس چیز کو خدا کا منشاء جانتے ہیں اس بارے میں مضبوط رویہ رکھتے ہیں۔

تحمل کیا ہے؟ لفظی اعتبار سے لفظ تحمل کا مطلب ''برداشت کرنا'' ہے۔ تصوراتی طور پر اس کا مطلب دنیا کی تہذیب میں موجود عظیم اختلافات، نکتہ ہائے نظر اور زندگی گزارنے کے مختلف انسانی طرائق کی عزت کرنا اور انہیں تسلیم کرنا ہے۔ عربی میں اسے تسامح کہتے ہیں۔ عربی میں اور بھی کئی الفاظ موجود ہیں جس کا یہی مفہوم ہے جیسے کہ حلم (چھوڑ دینا) یا عفو (معاف کرنا) یا صفہ (نظر انداز کر دینا) وغیرہ۔ فارسی اور اردو میں ہم لفظ رواداری استعمال کرتے ہیں جو دو الفاظ روا یعنی تسلیم کیے جانے کے قابل یا قابل برداشت اور داشتن یعنی پکڑنے سے مل کر بنا ہے۔ چنانچہ اس کا مطلب ایک ایسی چیز ہے جو پکڑے جانے کے قابل یا تسلیم کیے جانے کے لائق یا پھر قابل برداشت ہو۔

ایک مذہبی ذمہ داری

تحمل اسلام کا بنیادی اصول ہے۔ یہ ایک مذہبی اور اخلاقی ذمہ داری ہے۔ میری مراد چھوٹ دینے، چھوڑنے یا شامل ہو جانے سے نہیں ہے۔ اس کا مطلب بے اصولی یا اپنے اصولوں کے بارے میں غیر سنجیدہ ہو جانا بھی نہیں ہے۔ بعض دفعہ یہ کہا جاتا ہے کہ لوگ ان چیزوں کے بارے میں متحمل مزاج ہوتے ہیں جن کی وہ کوئی پرواہ نہیں کرتے''۔ لیکن اسلام میں ایسا نہیں ہے۔ اسلام میں تحمل کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم یہ یقین رکھتے ہیں کہ تمام مذاہب ایک جیسے ہیں۔ اس کا یہ بھی مطلب نہیں ہے کہ ہم دیگر نظریات اور مذاہب کے مقابلے میں اسلام کے بطور مذہب اور نظریہ بالاتر ہونے کے قائل نہیں ہیں۔ اس کا یہ مطلب بھی نہیں ہے کہ ہم اسلام کی تبلیغ کرنا اور دنیا کے دیگر انسانوں کو مسلمان بنانا نہیں چاہتے۔

لیکن یہ درست نہیں ہے کہ اسلام ان یہود و نصاریٰ کو جو مسلمان حکومتوں میں رہتے ہیں ذمیوں کا

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

(عربی لفظ مراد حفاظت میں لیے ہوئے لوگ) درجہ دیتا ہے۔ ذمی کا یہ تصور ۶۲۸ء میں شروع ہوا جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک یہودی قبیلے کو شکست دی جو خیبر کے پاس ریگستان میں رہا کرتا تھا اور ایک ان کے ساتھ ایک معاہدہ کیا جسے ذمہ کہا جاتا ہے۔ اس معاہدے کے تحت یہودیوں کو اس ریگستان میں آدھی فصل مسلمانوں کو دینے کی شرط کے ساتھ کاشتکاری کرنے کی اجازت دی گئی تھی۔ یہ معاہدہ مسلمانوں میں ہمیشہ ایک مثال کے طور پر یاد رکھا گیا۔

کچھ مغربی دانشور اسلام میں جذیہ (غیر مسلموں پر لگایا جانے والا ٹیکس) کی موجودگی کو ایک ناانصافی گردانتے ہیں۔ لیکن یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں پر ایک طرح کا دباؤ ڈالنے کے لیے ٹیکس نافذ نہیں کیے۔ انہوں نے یہ حکم دیا کہ ٹیکسوں کی کل مقدار تمام غیر مسلموں کی آمدنی کے مطابق طے کی جائے۔ اس کے برعکس یہ ان کی مسلمان حکومت میں شہریت کے جذبے کو مضبوط بنانے کے لیے رکھا گیا تھا۔ یہ بات بھی واضح کردی گئی تھی کہ جذیہ کی رقم کی ادائیگی غیر مسلموں کی جان و مال کی حفاظت پر اٹھنے والے اخراجات کے پورا کرنے کے لیے لگائی گئی تھی۔ بطور شہری یہ ان کا حق تھا کہ اپنے معاشرے کی حفاظت کے لیے رقم خرچ کریں۔ مزید براں ان میں سے غربا کے لیے جزیہ دینا ضروری نہیں تھا بلکہ وہ مالی اعانت کے لیے مسلمانوں کی طرح زکوۃ کی مد میں اکٹھی ہونے والی رقم میں سے اپنے لیے کچھ لینے کے بھی حقدار تھے۔ قصہ مختصر، ان کے پاس شہری حقوق موجود تھے۔

چنانچہ ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمان تاریخ کے ہر دور میں بہت متحمل مزاج لوگ رہے ہیں۔ ہمیں یہ سوچ مسلمانوں اور آج کی دنیا میں اجاگر کرنی چاہیے۔ ہمارے معاشروں میں تحمل مزاجی کی ضرورت ہے۔ مسلمانوں کو خصوصی طور پر اپنے مساعی اور اپنی حکمت عملی میں عمداً تحمل مزاجی کو رواج دینا چاہیے۔ ہمارے مراکز کثیر الانسانی ہونیا چاہییں۔ ہمیں اپنے بچوں کو ایک دوسرے کا احترام سکھانا ہوگا۔ ہمیں دیگر نسلوں اور ثقافتوں کے بارے میں کوئی کلی نظریہ قائم کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔ ہمیں دوسروں کے پاس جانے اور ان سے ملنے میں اضافہ کرنا ہوگا۔ مسلمانوں کی مختلف نسلوں کے درمیان رشتہ ازدواج قائم کرنے کے جذبے کی بھی حوصلہ افزائی کرنا ہوگی۔

ہمیں غیر مسلموں کے ساتھ بات چیت اور اچھے تعلقات رکھنے چاہیں لیکن ہم ایسی باتیں تسلیم نہیں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کر سکتے جو ہمارے مذہب سے متصادم ہوں۔ ہمیں غیر مسلموں کو یہ باور کرا دینا چاہیے کہ ہمارے لیے کیا قابل قبول ہے اور کیا نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ معلومات کے اس اضافے سے دوطرفہ عزت اور تعاون میں اضافہ ہوگا۔ (باہمان بختیاری نے فارسی سے ترجمہ کیا)

© rasailojaraid.com